زکوٰۃ کے مستحق کون ہیں؟

کیا زکاۃ علمی و اشاعتی اداروں کو دی جا سکتی ہے؟

مولانا محمد شہاب الدین ندوی، جنرل سکریٹری فرقانیہ اکیڈمی، بنگلور

(۶)

اور صاحب بحر الرائق تحریر کرتے ہیں: ولا یخفی ان قید الفقیر لا بد منہ علی الوجوہ کلھا۔ اور مخفی نہیں ہے کہ محتاج کی قید تمام صورتوں میں ضروری ہے۔[۸۶]

اور صاحب ہدایہ تحریر فرماتے ہیں: ولا یصرف الی غنی الغزاۃ عندنا، لان المصرف ھو الفقراء: اور مالدار غازیوں پر زکاۃ کی رقم صرف کرنا ہمارے نزدیک جائز نہیں ہے کیونکہ مصرف محتاج ہی ہوا ہے۔[۸۷]

ظاہر ہے کہ یہ ایک زائد شرط ہے جو نہ صرف قرآن پر ایک اضافہ ہے بلکہ اوپر حدیثوں کی تشریحات کے بھی خلاف ہے۔ اور اس زائد شرط کا نتیجہ یہ ہوا

۸۶۔ البحر الرائق، از علامہ ابن نجیم ۲۶۲/۲، مطبوعہ کراچی (پاکستان)

۸۷۔ ہدایہ مع فتح القدیر ۲۰۵/۲، مطبوعہ کوئٹہ (پاکستان)۔

کہ مذکورہ بالا آٹھ اصناف کی مستقل حیثیت باقی نہیں رہی۔ بلکہ زکاۃ وصول کرنے والوں کو چھوڑ کر بقیہ سات قسمیں پہلی قسم (فقراء) محصور ہو کر رہ گئیں، اس اعتبار سے احناف کے نزدیک زکاۃ لینے والوں کی آٹھ قسمیں صرف دو ہی رہ جاتی ہیں ایک محتاج لوگ (فقراء) اور دوسرے زکاۃ وصول کرنے والے (عاملین) اور بقیہ چھ قسمیں معطل ہو کر رہ گئیں۔ اور اس میں بھی ایک تناقض یہ ہے کہ جب فقر و احتیاج ہر صورت میں ضروری ہے، تو "عامل" کا استثناء کیوں؟ اس کے لئے بھی فقر و احتیاج ضروری کیوں نہیں قرار دیا؟ اور پھر جب ایک محتاج شخص مجاہد، مقروض اور مسافر بنے بغیر بھی زکاۃ لے سکتا ہے تو پھر مجاہد، مقروض اور مسافر کا الگ الگ ذکر کرنے کا فائدہ ہی کیا رہا؟ اسی بنا پر احناف کے علاوہ بقیہ ائمہ (امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ) کے نزدیک مجاہد، مقروض اور مسافر کے لئے محتاج ہونا ضروری نہیں ہے۔ اور یہ مسلک بہت معقول معلوم ہوتا ہے۔ جبکہ احناف جو اپنی معقولیت پسندی میں زیادہ مشہور ہیں وہ اس مسئلے میں غیر معقول نظر آتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ قرآن کی آٹھوں مدیں اپنی اپنی جگہ پر مستقل ہیں تو پھر بغیر کسی زائد شرط کے ان کا استقلال باقی رہنا چاہئے۔ اور پھر اوپر جو حدیثیں پیش کی گئی ہیں وہ اس سلسلے میں حجت ہیں، اور ان سے یہ حقیقت قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ اس سلسلے میں زائد شرطیں عائد کرنا غیر ضروری ہے۔ چنانچہ مذکورہ بالا حدیثوں کی رو سے ایک مالدار شخص (یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ لکھ پتی اور کروڑ پتی ہو بلکہ مراد غالباً نچلی سطح کا ایسا مالدار بھی ہو سکتا ہے جو غریبی کی سطح سے کچھ ہی بلند ہو۔ اگرچہ وہ اصطلاحی طور پر صاحب نصاب

ب ذیل چار صورتوں میں زکوٰۃ کے مال سے مستفید ہو سکتا ہے۔

۱۔ جبکہ وہ مال زکوٰۃ کا عامل ہو؛

۲۔ جبکہ وہ مقروض ہو؛

۳۔ جبکہ وہ اللہ کی راہ میں کام کر رہا ہو؛

۴۔ جبکہ وہ حالت سفر میں کسی مصیبت سے دوچار ہوگیا ہو۔

جب قرآن مجید نے بغیر کسی شرط کے ان آٹھوں مصارف کا ذکر مستقل نیت سے کیا ہے تو اب زائد شرطوں کو عائد کرنا قرآن ابدایک اضافہ وگا اور مذکورہ بالا حدیثوں کے خلاف بھی اور پھر صرف عامل کو چھوڑ تے ہوئے بقیہ تین قسم کے لوگوں کے لئے ایک دوسرا معیار قائم کرنا ایک ہ اصولی ہے۔

دونوں مسلکوں میں تطبیق ممکن ہے۔

واضح رہے اس سلسلے میں فقہائے احناف کی دلیل یہ حدیث ہے:

إِنَّ اللّٰهَ افْتَرَضَ عَلَيْهِمْ صَدَقَةً فِي أَمْوَالِهِمْ تُؤْخَذُ مِنْ أَغْنِيَائِهِمْ وَتُرَدُّ عَلَىٰ فُقَرَائِهِمْ: اللہ نے مسلمانوں پر زکاۃ فرض کی ہے جو اُن کے مالداروں سے لی جائے گی، اور اُن کے محتاجوں (غریبوں) پر لوٹا دی جائے گی۔

اس حدیث کی رُو سے احناف کا کہنا یہ ہے چونکہ یہاں پر زکاۃ مالداروں سے لے کر غریبوں میں تقسیم کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے، اس لئے مذکورہ بالا آٹھ قسموں میں سے ہر قسم کے لوگوں کا غریب (یعنی فقیر ہونا) ضروری ہے۔ تو اس موقع پر دو باتوں کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے، جس کے باعث یہ الجھا ہوا مسئلہ

حل ہو سکتا ہے چاروں مسلکوں میں اس [illegible] ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں پہلی بات یہ ہے کہ لفظ "فقیر" کی تعریف اور اس کے تعین کا اختلاف کے باعث یہ اختلاف پیدا ہوا ہے۔ فقیر کی شرعی تعریف کیا ہے؟ اس میں چاروں مسلکوں کا اختلاف ہے۔ فقہائے احناف کے نزدیک فقیر وہ ہے جو صاحب نصاب (ساڑھے سات تولے سونے یا ساڑھے باون تولے چاندی کا مالک) نہ ہو[۵۸]۔ جب کہ دوسرے فقہاء کے نزدیک فقیر وہ ہے جو ضرورت کے مطابق چیزوں کا مالک نہ ہو اور نہ کوئی حلال پیشہ اسے میسر ہو[۵۹]۔ (خواہ وہ صاحب نصاب ہو یا نہ ہو) اور یہ دونوں تعریفیں محض قیاس و اجتہاد کا نتیجہ ہیں (کسی نص قطعی پر مبنی نہیں) چنانچہ فقیر اور مسکین سے کیا مراد ہے۔ اس کی تعریف میں امام قرطبیؒ نے سلف صالحین کے نو اقوال بیان کیے ہیں[۶۰] لہٰذا ان قیاسی تعریفوں کے چکر میں الجھ کر قرآن اور حدیث کے نصوص و احکام میں حرج پیدا ہو گیا ہے۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ موجودہ دور میں انکار حدیث کا فتنہ نہایت درجہ زور و شور سے پرورش پا رہا ہے۔ لہٰذا اس فتنہ کے استیصال کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ہمارے ذخیرۂ حدیث پر استقرائی حیثیت سے نظر ڈالی جائے اور نئے سرے

۵۸:۔ یعنی بیس مثقال سونا یا دو سو درہم چاندی، دیکھئے در مختار بر حاشیہ رد المحتار ۲/۳۱۲ مطبوعہ کوئٹہ، البحر الرائق ۲/۲۲۵ مطبوعہ کراچی، بدائع الصنائع ۲/۱۶-۱۷ مطبوعہ کراچی، فتاویٰ عالمگیری ۱/۱۸۹ مطبوعہ کوئٹہ۔

۵۹:۔ دیکھئے فقہ الزکاۃ، از ڈاکٹر یوسف قرضاوی ۲/۵۴۴، موسسۃ الرسالہ بیروت

۶۰:۔ دیکھئے تفسیر قرطبی ۸/۱۶۸، ۱۷۱

ہے اجتہاد کی مدد سے ہماری حقیقی غلطیوں کو دور کیا جائے۔ اور اس سلسلے میں ضروری ہے کہ جن حدیثوں میں بظاہر اختلاف نظر آتا ہو ان میں جمع و تطبیق کی راہ اختیار کی جائے۔ تاکہ ایک طرف تمام حدیثوں پر عمل بھی ہو جائے تو دوسری طرف انکارِ حدیث کا فتنہ بھی اپنی موت آپ مر جائے۔ ورنہ تمام حدیثیں اختلافات کا ایک اکھاڑہ نظر آئیں گی اور ہماری ملت کو کشمکش اور انتشارِ فکری سے کبھی نجات نہیں مل سکے گی۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو نظر آئے گا کہ مذکورۂ بالا حدیثوں اور احناف کی استدلال کردہ حدیث میں سرے سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔ بلکہ انہیں عموم و خصوص پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ یعنی احناف کی مستدل حدیث کو عمومی حالات پر اور سابقہ حدیثوں کو خصوصی احوال پر محمول کیا جائے۔ اس طرح قرآن، حدیث اور فقہ تینوں میں تطبیق ہو جائے گی اور ہر ایک مسلک پر عمل کرنا آسان ہو جائے گا۔ ظاہر ہے کہ احناف کے مسلک میں کچھ سختی پائی جاتی ہے اور دیگر ائمہ کے مسلک میں کچھ نرمی دکھائی دیتی ہے۔ لہٰذا ان دونوں مسلکوں کو احوال پر منطبق کر دیا جائے تو یہ جھگڑا سرے سے ختم ہو سکتا ہے۔

امام محمدؒ کا فتویٰ :-

اس سلسلے میں مطلوبہ دلیل امامِ اعظم ابو حنیفہؒ کے شاگردِ خاص اور فقہ حنفی کے مدوّن امام محمدؒ کے ایک فتوے سے ہمیں کافی مدد مل سکتی ہے جو اہلِ علم کے لئے ایک لمحۂ فکریہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ بلکہ اس سلسلے میں خود فقہائے احناف کے بعض چونکا دینے والے فتاویٰ بھی موجود ہیں۔ جن کو علامہ ابن عابدینؒ نے امام سرخسیؒ کی مشہورِ آفاق کتاب المبسوط اور بعض دیگر فتاویٰ کے حوالے سے احناف کی مستند ترین کتاب ردّ المحتار (یعنی فتاویٰ شامی) میں اور اس کے علاوہ ایک اور مستند کتاب البحر الرائق کے حاشیہ میں تحریر کیا ہے۔ یہ فتاویٰ بڑے بصیرت افروز ہیں۔

ہمارے اس سلسلے کی ساری گتھیاں سلجھ جاتی ہیں۔ اور وارد ہونے والے شکوک وشبہات پیدا کرکے اعتراضات کرنے والوں کا منہ بند ہو جاتا ہے۔

معترض کے حق میں یہ ژولیدہ فکری منادی اور ان پر مفصل تبصرہ تو آگے آتا ہے مگر اس موقع پر امام محمدؒ کا فتوی ہی نقل کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے جسے انہوں نے اپنی موطا میں حدیث مذکور کے بعد بیان کیا ہے۔ چنانچہ یہ حدیث اور فتوی دونوں ملاحظہ ہوں۔

اَخْبَرَنَا مَالِكٌ، حَدَّثَنَا زَيْدُ بْنُ اَسْلَمَ عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ، اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَا تَحِلُّ الصَّدَقَةُ لِغَنِيٍّ اِلَّا لِخَمْسَةٍ، لِغَازٍ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ، اَوْ لِعَامِلٍ عَلَيْهَا، اَوْ لِغَارِمٍ، اَوْ لِرَجُلٍ اشْتَرَاهَا بِمَالِهٖ، اَوْ لِرَجُلٍ لَهٗ جَارٌ مِسْكِيْنٌ تُصُدِّقَ عَلَى الْمِسْكِيْنِ فَاَهْدٰى اِلَى الْغَنِيِّ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی مالدار شخص کے لئے زکاۃ کا مال لینا جائز نہیں ہے، بجز پانچ صورتوں کے: (۱) جب کہ وہ اللہ کی راہ میں لڑ رہا ہو (۲) جب کہ وہ زکاۃ وصول کر رہا ہو (۳) جب کہ وہ قرضدار ہو، (۴) جبکہ وہ زکاۃ کی چیز کو اپنے مال کے بدلے میں خرید لے، (۵) جبکہ کوئی مسکین شخص زکاۃ کی چیز کو اسے بطور ہدیہ بھیج دے۔

اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد امام محمدؒ بطور فتوی تحریر کرتے ہیں۔

وَبِهٰذَا نَاخُذُ، وَالْغَازِيْ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ اِذَا كَانَ لَهٗ عَنْهَا غِنًى، يَقْدِرُ بِغِنَاهُ عَلَى الْغَزْوِ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ لَمْ يُسْتَحَبَّ لَهٗ اَنْ يَّاْخُذَ مِنْهَا شَيْئًا۔ ہم اسی حدیث کو اختیار کرتے ہیں چنانچہ اللہ کی راہ میں لڑنے والے کے لئے جب کچھ مال موجود ہو جس کی وجہ سے

وہ اللہ کی راہ میں لڑنے کی قدرت رکھتا ہو تو اس کے لئے زکاۃ کے مال سے کچھ لینا غیر مستحب ہے (یعنی اچھا نہیں ہے)۔ ۹۱

اس طرح وہ مقروض (غارم) کے بارے میں بھی یہی فتویٰ صادر کرتے ہوئے ان دونوں فتاویٰ کو امام ابوحنیفہ رح کا قول بتاتے ہیں۔

وكذا هذا الغارم إذا كان عنده وفاء بدينه وفضل تجب فيه الزكاة، لم يستحب له أن يأخذ منها شيئاً، وهو قول أبي حنيفة

یہ حال مقروض کا بھی ہے۔ جب کہ اس کے پاس قرض کی ادائیگی کے بعد اتنا مال بچ جائے جس پر زکاۃ واجب ہو جاتی ہے تو اس کے لئے بھی زکاۃ کی رقم لینا غیر مستحب ہے۔ یہی قول امام ابوحنیفہ کا ہے۔ ۹۲

دیکھئے یہاں پر امام محمد نے امام ابوحنیفہ رح کے حوالے سے اس نقل کو محض استحباب پر محمول کرتے ہوئے اسے کسی شخص کا ایک اخلاقی معاملہ قرار دینے پر اکتفا کیا ہے کہ اگر وہ چاہے تو لے چاہے تو نہ لے۔ مگر نہ لینا اس کے لئے صرف مستحب ہے ناجائز نہیں۔ لیکن متاخرین احناف نے اسے شرعی و قانونی طور پر ناجائز قرار دے کر اصل مسلک سے انحراف کیا ہے۔ لہٰذا قرآن و حدیث پر صحیح معنی میں عمل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان کی تصریحات (نصوص) کو ہر حالت میں اصل قرار دے کر اپنی غلطیوں کو درست کیا جائے۔

اس بحث کا حاصل یہ کہ خود فقہ حنفی میں اس کی گنجائش موجود ہے کہ عمومی حالات میں عام فتاویٰ پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ مگر بعض خاص یا ہنگامی حالات میں خصوصی فتاویٰ کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔ مگر عام فتاویٰ کو ہر حالت میں پتھر کی لکیر

---

۹۱ و ۹۲ [illegible] امام محمد ص ۱۵۰، مطبوعہ کراچی ص ۱۰۲، مطبوعہ دار القلم، بیروت،

وہ دینِ خداوندی ہی فقہ سے ناواقفیت کا ثبوت ہے لہٰذا موجودہ دور کے حالات کی مناسبت کی رُو سے اپنے فتاویٰ میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ چنانچہ راقم سطور نے اپنے مضمون میں اسی ضرورت پر زور دیا تھا تو معترض نے اس پر غیض میں آکر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ اور میرے مضمون کو غلط اور بے سروپا ثابت کرنے کے چکر میں دین و شریعت کے بعض بنیادی حقائق ہی کا انکار کر دیا کہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔ مگر اب انہیں اپنے سیاہ کرتوتوں کی سزا بھگتنی ہوگی۔

ع مجھ کو معلوم ہے پیرانِ حرم کے انداز   نہ ہو اخلاص تو دعویٰ نظر لاف و گزاف

لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا۔

زیرِ بحث حدیث (لا تحل الصدقة لغنی الا لخمسة ....) کو معترض نے اپنا مہمل دعویٰ ثابت کرنے کے لئے بڑے زور و شور کے ساتھ پیش کیا تھا۔ مگر عبرت کی بات یہ ہے کہ اُن کا یہ دعویٰ ثابت ہونے کے بجائے اُلٹے یہ حدیث اُن کے خلاف ایک حجت بن گئی۔ اور اس طرح وہ خود اپنے ہی بچھائے ہوئے جال میں بُری طرح پھنس گئے ہیں کیونکہ مذکورہ بالا تفصیلات کی رُو سے یہ حدیث فقہ حنفی کے خلاف پڑتی ہے اور اس اعتبار سے یہاں پر وہی مثل صادق آرہی ہے کہ "گئے تھے نماز بخشوانے کو الٹے روزے بھی گلے پڑ گئے"۔

اس لحاظ سے معترض کا یہ دعویٰ غلط اور باطل ہو گیا کہ کسی مالدار شخص کو زکاۃ کی رقم دینا کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے۔ کیونکہ یہ بات خلافِ شریعت ہے۔ مگر عبرت کی بات یہ ہے کہ وہ خود ہی انجانے پن میں اپنے ہی دعویٰ کی دھجیاں اڑاتے ہوئے نہایت درجہ بے شرمی کے ساتھ اس حدیث کو اپنے فاتحانہ انداز میں پیش کر رہے ہیں۔ مگر اس زبردست تناقض و تضاد

یہ نہیں کوئی منبتہ ہی نہیں ہو سکتا ہے۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ یا تو خود گھاس کھا گئے ہیں۔ یا پھر ساری دنیا کو گھاس کھلانے پہ تُلے ہوئے ہیں۔ ؎

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

دیکھئے معترض نے اس حدیث کو اپنے لنگڑے دعوے کی تائید میں پیش کر کے خواہ مخواہ اپنے پیروں پہ آپ کلہاڑی مار لی ہے۔ اُن کے کل دعووں اور مزعومات کی بنیاد یہی واحد حدیث تھی، لہٰذا اب ان کا داؤ ان ہی پر اُلٹ جانے کی بدولت اُن کے فاسد نظریات کا شیش محل چکنا چور اور ان کا سارا علمی غرور خاک میں مل گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ مناظرہ بازی کے طور پر اور محض الزامی جواب دینے اور راقم سطور کا مُنہ بند کرنے کی غرض سے انہوں نے اس حدیث کو بطور ایک ہتھیار استعمال کیا تھا، مگر جب ان کے مزعومات کی بنیاد ہی غلط ہو گئی۔ تو ان کے سارے دعوے خرافات کا ایک پلندہ قرار پاتے ہیں، اس طرح اب اُن کو اپنے تمام دعوے اور پورا مضمون واپس لینا پڑے گا۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو پھر وہ "حق گو" نہیں رہیں گے، بلکہ باطل کے علمبردار بن جائیں گے چنانچہ حدیث مذکورہ سے بخوبی ثابت ہو گیا کہ:۔

۱۔ فی سبیل اللہ سے غازی مراد ہونا واحد مفہوم نہیں ہے، بلکہ اس میں حاجی اور وہ اہل علم بھی داخل ہیں جو علمی اعتبار سے دین اسلام کا دفاع کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ایسے لوگوں کو ایک حدیث میں "عامل فی سبیل اللہ" قرار دیا گیا ہے۔

۲۔ قرآن کے بیان کردہ آٹھ مصارف میں سے چار مصارف میں کوئی بھی شخص مالدار ہونے کے باوجود زکاۃ کی رقم سے مستفید ہو سکتا ہے:۔ جب کہ وہ عامل ہو، جب کہ وہ مقروض ہو، جب کہ وہ اللہ کی راہ میں کام کرنے والا ہو، اور جب کہ وہ مسافر ہو۔

۳ـ ... کرنے والوں سے مراد یہ لوگ ہیں جو غازی بن جائیں یا وہ عالم دین جو باطل کے مقابلے میں سینہ سپر ہو کر دین کا دفاع اور علم کی اشاعت میں مشغول ہو۔

۴ـ جہاد کے دو بازو ہیں، ایک فوجی و عسکری اور دوسرا علمی و تبلیغی اور یہ دونوں قسم کے مجاہد فی سبیل اللہ میں داخل ہیں۔

(ج) معترض اب اس حدیث کا انکار نہیں کر سکتے۔ کیونکہ انہوں نے اسے نہ صرف زور و شور سے پیش کیا ہے، بلکہ اسے قطعی طور پر قابل حجت بھی قرار دیا ہے جیسا کہ وہ خود تحریر کرتے ہیں ـ

" یہ حدیث زکاۃ ہی کے بارے میں وارد ہوئی ہے اور فن حدیث کی مستند... کتابوں میں مذکور ہے ناقدین حدیث نے اسے صحیح قرار دیا ہے ..... اس حدیث کو متعدد محدثین نے صحیح اور قابل احتجاج قرار دیا ہے۔" ۹۳ ـ

دیکھئے اب اس حدیث کو صحیح اور قابل احتجاج تسلیم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ زکاۃ کی رقم مذکورہ بالا تمام مصرفوں میں مالدار کو دی جا سکتی ہے۔ لہٰذا آپ کا دعویٰ باطل ہو گیا۔

" اور یہ بات محتاج بیان نہیں کہ اشاعتی اداروں کے مالکان جو عموماً مالدار یا کم از کم صاحب نصاب ہوتے ہیں انہیں زکاۃ کی رقم دینا قطعاً جائز نہیں ہے۔" ۹۴

اس موقع پر سوال یہ نہیں ہے کہ اشاعتی اداروں کے مالکان (حالانکہ اس موقع پر مالکان کا لفظ استعمال کرنا بھی ایک مغالطہ ہے) صاحب نصاب

---

۹۳ ـ الفرقان، اپریل ۱۹۸۸ء، ص ۳۵ ـ

۹۴ ـ ایضاً، اکتوبر ۱۹۸۸ء، ص ۳۴ ـ

[illegible] ؟ اسی طرح عشر و زکوٰۃ کو "اشاعتی" ادارے قرار دینا بھی ایک مضحکہ خیز مطلب ہے۔ کیونکہ ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ مگر اس موقع پر بحث طلب امر یہ ہے کہ ایک صاحب نصاب کے لئے ہر حال اور ہر صورت میں اس کو ممنوع قرار دینے کی گنجائش شرعاً کہاں نکلتی ہے؟ کیا یہ بات قرآن سے ثابت ہے؟ یا حدیث سے ثابت ہے؟ یا اصول حنفی فقہ سے ثابت ہے؟ بلکہ ان تینوں ماخذوں سے اس کا جواز نکل رہا ہے جیسا کہ ابھی ہم اوپر دیکھ آئے ہیں۔

واضح رہے کہ راقم سطور نے اپنے مضمون میں علمی و تحقیقی کام کرنے والوں کو صرف وظیفہ دینے کی بات کی تھی، مگر معترض نے اس موقع پر شرارتاً ایک "اشاعتی اداروں" کا نام لے کر عوام کا ذہن دوسری طرف موڑنے کی کوشش کی ہے اور پھر عوام کو گمراہ کرنے کے لئے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ کسی "اشاعتی ادارے" کو زکاۃ کی رقم دینا گویا کہ اس کے مالک کو دینا ہے۔ اس طرح وہ لوگوں کو بات بات میں چکمہ اور بات بات میں جھانسہ دینا چاہتے ہیں۔ بقول اقبالؔ ؎

زباں سے کر گیا توحید کا دعویٰ تو کیا حاصل
بنایا ہے بتِ پندار کو اپنا خدا تو نے

بہر حال یہ حدیث اگر قابل استدلال ہے تو پھر آپ کو اس "کڑوے سچ" کو تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ نہیں رہ جاتا، اور آپ کے حیلے بہانے اب زیادہ دیر تک چل نہیں سکتے۔ ذرا دیکھئے تو سہی آپ نے اپنے "فتوے" کی تردید خود اپنے ہی قلم سے کس طرح کر دی ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ سب نتیجہ ہے بے سوچے سمجھے ادھر ادھر سے چند بے پر کی باتیں جمع کر کے مضمون جھاڑنے کا۔ جب آپ کا تناقض و تضاد صاف ظاہر ہو گیا تو پھر اب آپ کو کیا حق ہے کہ یوں شریعت کی علمبرداری کا ڈھنڈورہ پیٹتے پھریں؟ دیکھئے آپ کے یہ "فتاویٰ" خود آپ کے لئے گلے کی ہڈی بن گئے ہیں، جنہیں اب نہ تو اُگلا جا سکتا ہے اور نہ نگلا

جا سکتا ہے، گویا کہ وہ مردوں کو بھی نسبتاً چکر میں خود ہی بُری طرح پھنسے ہیں، یہ نتیجہ ہے شریعت کے اصولوں سے ہٹ کر ضد اور ہٹ دھرمی کا راستہ اختیار کرنے کا۔

بہر حال اگر آپ اپنے دعوے کو سچا سمجھتے ہیں، اور اس حدیث کو قابل احتجاج قرار دیتے ہیں (جہاں اس سے انکار آپ کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں رکھتا ہے) تو پھر کیا آپ یہ "اعلان حق" کرنے کے لئے تیار ہیں، کہ احناف کا مسلک غلط ہے، جو اس حدیث کو ترک کئے ہوئے ہیں؟ اور جب آپ یہ "اعلان حق" کر دیں گے تو پھر آپ کے لئے ضروری ہے کہ اپنے اس بیہودہ مضمون کو خود اپنے ہاتھ سے چولہے میں جھونک دیں، اور اس اعلان حق کے ساتھ ہی آپ نہ صرف ناچیز کی تحریر پر مہر تصدیق ثبت کرنے والے ہوں گے، بلکہ آپ حامیِ شریعت اور حق گو لوگوں کی فہرست میں بھی شامل ہو جائیں گے۔ بس یہی ایک حدیث آپ کے اور میرے درمیان فیصلہ کن چیز ہے۔

اب آپ کو دو باتوں میں سے کسی ایک کے اختیار کرنے کا حق حاصل ہے حدیث مذکور کو صحیح ماننے کی صورت میں میرا دعویٰ صحیح، اور آپ کا دعویٰ غلط ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر آپ اس کا انکار کر دیں تو خود آپ اپنے اس دعوے میں جھوٹے قرار پائیں گے۔ کہ یہ حدیث صحیح اور قابل حجت ہے۔ دیکھئے اِدھر کنواں ہے تو اُدھر کھائی، پہلی صورت میں آپ کی مثال اس عورت کی سی ہو جائے گی جس کی تمثیل قرآن حکیم میں اس طرح بیان کی گئی ہے۔

"وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِن بَعْدِ قُوَّةٍ أَنكَاثًا" اور تم اس عورت کی طرح نہ بن جانا، جس نے اپنے محنت سے کاتے ہوئے سوت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا" (نحل : ۲۹)

اور دوسری صورت میں آپ کی مثال ان لوگوں کی سی بن جائے گی جو عام حالات میں خداوند قدوس کو عالم اور حج ، نتے کے لئے تو تیار نہیں مگر جب خود ان کا کوئی حق نکل رہا ہو تو بھاگے بھاگے چلے آتے ہیں۔

وَإِذَا دُعُوا إِلَى اللّٰهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِنْهُمْ مُعْرِضُونَ ، وَإِنْ يَكُنْ لَهُمُ الْحَقُّ يَأْتُوا إِلَيْهِ مُذْعِنِينَ ، اور جب انہیں اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ ان کے درمیان فیصلہ کرے ، تو ان میں کا ایک گروہ منہ موڑ لیتا ہے ، لیکن اگر ان لوگوں کا کوئی حق ثابت ہو رہا ہو تو وہ رسول کے پاس گردن جھکائے چلے آتے ہیں۔ (نور ، ۴۷ ، ۴۸)

یہ نتیجہ ہے دین و شریعت میں ٹانگ اڑا کر خواہ مخواہ مغالطے پیدا کرنے کا۔ اسی لئے ایک حدیث میں کہا گیا ہے۔

عَنْ مُعَاوِيَةَ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنِ الْغُلُوطَاتِ ۔ معاویہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مغالطہ انگیز باتوں سے منع فرمایا۔ ش۹۵

امام اوزاعیؒ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں کہ اس سے مراد شر انگیز مسائل ہیں۔

امام خطابیؒ تحریر کرتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ علماء ایسے مشکل مسائل کے پیچھے پڑ جائیں جن میں غلط باتیں مذکور ہوں ، تاکہ ان کے ذریعہ وہ کسی کو لغزش میں مبتلا کر سکیں اور لوگوں کی رائے تبدیل کر سکیں۔

ش۹۵ :- سنن ابوداؤد کتاب العلم ، ۴ / ۶۵

قال الأوزاعي هي شداد المسائل ـ والمعنى أنه نهى
يعترض العلماء بصعاب المسائل التي يكثر فيها الغلط
ليستزلوا ويستقط رأيهم فيها ـ ۹۵

۲۔ حکمت کی پہلی برہان

کسی مسئلے میں تحقیق کا طریقہ یہ ہونا چاہیئے کہ سب سے پہلے دلائل پیش کئے جائیں پھر اُن کی قوت سے بحث کی جائے۔ لیکن اس کے برعکس یہ طریقہ بالکل غلط ہوگا کہ کسی مسئلے میں (جب کہ وہ خصوصاً اختلافی بھی ہو) تو اس میں بجائے دلائل کے بعض مصنفین (اور وہ بھی مخالف مسلک رکھنے والوں) کی مجرد رایوں اور اُن کے ادّعات سے محض الزامی نقطۂ نظر سے استدلال کیا جائے۔ یہ طریقہ مناظرہ بازی میں یا فریق مخالف کا منہ تھوڑی دیر کے لئے بند کرنے کے لئے تو چل سکتا ہے، مگر علم و تحقیق کی دنیا میں ہرگز بار نہیں پا سکتا۔ یہ بات سبھی اہل علم بخوبی جانتے ہیں کہ مختلف فقہا کے درمیان باہمی رقابت اور چشمک رہتی ہے اور ہر مسلک والے دوسرے مسلک پر طعن و تعریض کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ اس قسم کی تعریضات و تنقیدات سے ہمارا فقہی ذخیرۂ کتب بھرا ہوا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ اس قسم کی کسی تنقید یا تعریض کو اب کسی کا منہ بند کرنے کے لئے استعمال کرنا ایک قسم کی شعبدہ بازی ہے، جیسا کہ معترض نے اس کا ارتکاب اپنے مضمون میں ابن العربی مالکی کی ایک عبارت پیش کرتے ہوئے کیا ہے۔ امام مالکؒ کا مسلک یہ ہے کہ ...
فی سبیل اللہ سے مراد جہاد ہے۔ اور ابن العربی اپنے اس مسلک کی حمایت میں بڑے

۹۵۔ سنن ابو داؤد، کتاب العلم، ۴/۶۵-۶۶، مطبوعہ حمص، ۱۳۹۲ھ

شے نظر آتے ہیں۔ اور امام احمد بن حنبلؒ اور امام اسحٰق بن راہویہؒ کے اسی
ک کی تغلیط کرتے ہوئے کہ اس سے مراد حج ہے، یہاں تک کہتے ہیں کہ اس
وہ شریعت میں رخنہ اور شگاف پیدا ہو جاتا ہے۔ موصوف کی اصل عبارت
یہ ہے —

قال مالك سبل الله كثيرة ولكني لا أعلم خلافاً في أن
المراد بسبيل الله ههنا الغزو من جملة سبيل الله، إلا
ما يؤثر عن أحمد وإسحاق، فإنهما قالا إنه الحج،
والذي يصح عندي من قولهما أن الحج من جملة السبل
مع الغزو، لأنه طريق بر، فأعطي منه باسم السبيل
وهذا يحل عقد الباب ويخرم قانون الشريعة وينثر
سلك النظر، وما جاء قط بإعطاء الزكاة في الحج أثر، ؎۹۶

معترض کا نقطۂ نظر چونکہ تحقیقی نہیں، بلکہ سطحی دعوائی ہے اس لیے عوامی
بات کے استعمال کے لئے وہ نہایت دلیری ہوشیاری کے ساتھ مجتہد
اور علماء کے اقوال اکٹھا کر کے ان کا ایک تانا بانا محض الفاظ کے ذریعہ
یار کرتے ہیں۔ تاکہ کسی نہ کسی طرح ان کے باطل نظریہ کی تائید ہو سکے اور
سلسلے میں جہاں کہیں سے بھی کوئی بات ملتی ہے، اسے فوراً اُچک لیتے ہیں چنانچہ
العربی کی مذکورہ بالا عبارت کو انہوں نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ
ل کر کے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ فی سبیل اللہ سے غزوہ و قتال کے علاوہ
وئی دوسرا مفہوم مراد لینا قطعاً غلط اور دین میں شگاف پیدا کرنا ہے۔ ؎۹۷

۹۶۔ احکام القرآن، محمد بن عبداللہ ابن العربی مالکی (م ۵۴۳ھ) ۲/ ۹۶۷، دار المعرفۃ بیروت
۹۷۔ دیکھئے ماہنامہ الفرقان، اگست ۱۹۸۸ء، ص ۲۲

جیسا کہ عرض کیا گیا کسی مسئلے کی تحقیق میں بجائے علمی دلیل کے مخصوص مسلک والوں کی تعریف و تنقید کو پیش کرنا علمی اعتبار سے ایک مغالطہ ہے اور اس کا منطقی نتیجہ یہ ہوگا، کہ آپ علمی نقطۂ نظر سے "مسلک مخالف" کو صحیح تسلیم کر رہے ہیں۔ اگر یہی بات ہے تو پھر آپ کو کسی بھی مسئلے میں اپنے فقہی مسلک کو ترک کر کے فلاں اور فلاں کا مسلک اختیار کر لینا چاہئے۔ اور زیر بحث مسئلے میں کم از کم آپ کو علامہ ابن حزمؒ کا مسلک اختیار کرنا پڑے گا جن کی رائے کو آپ نے ابن العربی کی رائے کے بعد بطور تائید نقل کی ہے۔ تو کیا آپ اس کے لئے تیار ہیں؟ بے اصولی اور بددیانتی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔

بہر حال یہ پوری عبارت ظلمات بعضہا فوق بعض کا ایک پشتارہ نظر آتی ہے۔ اور اس میں ہر طرف جھول ہی جھول نظر آتا ہے۔ چنانچہ چند مزید نکات ملاحظہ ہوں:

اس سلسلے میں پہلی بات یہ کہ اس موقع پر امام احمد اور امام اسحاق صرف دو ہی افراد کا اختلاف نہیں بلکہ اس اختلاف میں امام محمدؒ اور امام حسن بصریؒ بھی[99] شامل ہیں۔ اور اس مسلک والوں کو صحابہ کرام کی بھی تائید و حمایت حاصل ہے جو "جمہور کے مسلک" والوں کو حاصل نہیں ہے۔ اس اعتبار سے فقہاء کی آدھی تعداد ایک طرف ہے تو آدھی تعداد (امام مالک، امام ابو یوسف اور امام شافعیؒ) دوسری طرف، لہٰذا تعداد اور قوت کے اعتبار سے یہ دونوں مسلک تقریباً برابر برابر ہیں۔

دوسری بات یہ کہ امام احمد بن حنبلؒ کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ ان کے مسلک میں مختلف حدیثوں کے پیش نظر توسیع ہوتی ہے۔ اور کسی مسئلے میں عموماً

---

[99] دیکھئے بخاری کتاب الزکاۃ ۲/۱۲۸، نیز تفسیر قرطبی۔

ان سے دو دو اقوال مروی ہوتے ہیں اور ان اقوال کی بنیاد حدیثوں پر ہوتی ہے۔ لہٰذا اس سلسلے میں مروی حدیثوں کو امام احمد بن حنبل ابن العربی سے زیادہ جانتے ہیں۔

تیسری بات جو ایک عجوبہ معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ابن العربی فی سبیل اللہ سے حج لینے والے مسلک پر شدت سے تنقید کرتے ہوئے اس کو شریعت میں ایک شگاف پیدا کرنے والی بات قرار دے رہے ہیں، اور معترض اس کو بڑی تحسین کے ساتھ نقل بھی کر رہے ہیں۔ جبکہ دوسری طرف وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام سے اس سلسلے میں مروی حدیثوں کو بھی بہت بڑی حد تک صحیح سمجھتے ہیں یا للعجب! اتنے صریح تناقض کے ساتھ یہ دونوں باتیں بیک وقت صحیح کیسے ہو سکتی ہیں؟ اس کا مطلب یہ ہوا کہ معاذ اللہ خود رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد حضرت ابن عباس رضؓ اور حضرت ابن عمر رضؓ نے شریعت میں شگاف پیدا کیا، اور اس کا دروازہ کھولا۔ کیا کوئی صحیح الدماغ آدمی کے قلم سے اس قسم کی تحریر نکل سکتی ہے؟ چنانچہ اس سلسلے میں خود معترض ہی کی تحریر ملاحظہ ہو۔

"غازیوں کو فی سبیل اللہ کا مصداق قرار دینے کے علاوہ صحابہ و مجتہدین کے یہاں اگر کوئی دوسرا قول ملتا ہے تو یہ غازیوں کے ساتھ ضرورت مند حجاج بھی "فی سبیل اللہ" میں داخل ہیں۔ یہ مسلک صحابۂ کرام میں حضرت ابن عمر رضؓ، حضرت ابن عباس رضؓ کا ہے۔ اور مجتہدین میں امام محمدؒ اور اسحاقؒ کا ہے امام احمد کے دو قول ہیں ایک جمہور فقہاء کے موافق اور دوسرا ان کے خلاف "[1]

---

[1] ماہنامہ الفرقان، اگست ۱۹۸۸ء ص ۲۳، ۲۴

جا سکتا ہے، گویا کہ دونوں حدیثیں ہی شرار المسائل - والمعنی انہ نہی
یعنی یہ نتیجہ ہے کہ یعترض العلماء بصعاب المسائل التی یکثر فیہا الغلط
کرنے کا۔ معالم السنن ۴/ ۱۸۶ ملاحظہ

علم و حکمت کی پھلجھڑیاں۔

کسی مسئلے میں تحقیق کا طریقہ یہ ہونا چاہئے کہ سب سے پہلے دلائل پیش کئے جائیں پھر اُن کی قوت سے بحث کی جائے۔ لیکن اس کے برعکس یہ طریقہ بالکل غلط ہوگا کہ کسی مسئلے میں (جب کہ وہ خصوصاً اختلافی بھی ہو) تو اس میں مخالف دلائل کے بعض مصنفین (اور وہ بھی مخالف مسلک رکھنے والوں) کی مجرد رائے اور اُن کے ادعاءات سے محض الزامی نقطۂ نظر سے استدلال کیا جائے۔ یہ طریقہ مناظرہ بازی میں یا فریق مخالف کا منہ تھوڑی دیر کے لئے بند کرنے کے لئے تو کیا جا سکتا ہے، مگر علم و تحقیق کی دنیا میں ہرگز بار نہیں پا سکتا۔ یہ بات سبھی اہلِ علم بخوبی جانتے ہیں کہ مختلف فقہاء کے درمیان باہمی رقابت اور چشمک رہی ہے اور ہر مسلک والے دوسرے مسلک پر طعن و تعریض کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ اس قسم کی تعریضات و تنقیدات سے ہمارا فقہی ذخیرۂ کتب بھرا ہوا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ اس قسم کی کسی تنقید یا تعریض کو اب کسی کا منہ بند کرنے کے لئے استعمال کرنا اسی قسم کی شعبدہ بازی ہے، جیسا کہ مضمون نگار نے اسی کا ارتکاب اپنے مضمون میں امام مالک کی ایک عبارت پیش کرتے ہوئے کیا ہے۔ وہ یہ کہ امام مالک کا مسلک ہے کہ فی سبیل اللہ سے مراد جہاد ہے اور اسے معترض اپنے اس مسلک کی حمایت میں

ف۶۵ و سنن ابو داؤد، کتاب العلم، ۴/ ۶۵، ۳۶۵۶، مطبوعہ مکہ ۱۳۹۳ھ